اردو زبان وادب کا تناظر۔اکیسویں صدی میں

ڈاکٹر محمد خاں اشرف

(ستارۂ جرأت)

Dr. Muhammad Khan Ashraf,

Associate Professor, Department of Urdu,

Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Urdu language and literature have a rich and a colorful tradition in the Sub Continent. Urdu language has its origins in the inter mingling of Muslims conquerors from the North and North West who occupied the India and local population which spoke different "Bhashaas". It was and has been a language of communication between different groups of people whose mother tongue was a different language. With the Pakistan Movement Urdu became a language of this movement and became synonymous with Muslim nationality. So after independence Urdu was banished from the areas of its birth. In Pakistan Urdu was declared a national language but has not been adopted as an official language of means of instructions so during the 20th century its existence has a big question mark. In this article Dr. Ashraf carries out a candid analysis of the situation facing Urdu worldwide in the 21st century.

سب سے پہلے تو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ وقت ایک سیلِ مسلسل، ایک دریا ہے جو ہر وقت رواں دواں رہتا ہے اور اس میں کوئی وقفہ، کوئی رکاوٹ نہیں آتی، انسان نے اپنے شعور کے ادراک کے ساتھ ہی وقت کو ماپنے اور اس کے گزرنے کا حساب لگانے کی کوشش کی ہے اور اسے ہمیشہ اپنی زندگی اور تاریخ کے اہم واقعات کے حساب سے ناپا ہے۔ ہمارے تمام کیلنڈر اجسامِ فلکی کی گردش اور انسانی زندگی کے اہم واقعات کے ایک بے ربط اور انمل گٹھ جوڑ سے عبارت ہیں اور ان میں کوئی بھی مکمل اور درست نہیں۔ سبھی ''تقریباً'' کی صفت کے حامل ہیں خواہ وہ اسلامی ہجری کیلنڈر رہو، عیسوی جیورجین یا بکرمی ہندی۔ تاہم انسان نے وقت کا حساب رکھنے کی کوشش کی ہے تا کہ اس کرۂ ارض پر اپنی عارضی زندگی کو ایک مربوط تاریخ اور قابلِ فہم تسلسل

دے سکے۔

اس نقطۂ نظر سے بیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ اور اکیسویں کا آغاز وقت کے لامتناہی سلسلے میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہے لیکن انسان کے وقت اور زندگی کے تعلق اور اپنی تاریخ اور حیات کو قابلِ فہم بنانے کے لیے یہ کئی لحاظ سے اہم ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اکیسویں صدی کا آغاز وقت کے تسلسل میں انسانی وجود کی تفہیم کے لیے ایک نہایت ہی اہم سنگِ میل ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

یہ کئی لحاظ سے اہم واقعہ ہے۔ یہ وقت کا ایک ایسا نشان ہے جب انسانی شعور اور انسان کا اس کرۂ ارض پر زندگی کا تصور اور طریق ایک بنیادی کشمکش اور انقلاب سے دوچار ہے۔ پسِ جدیدیت کا افتراق ہو یا گلوبیت کی یکسانی اور وحدت کی یلغار، انسان کے اپنے نسلی، عصبیتی، علاقائی شعور کی بیداری ہو یا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا عالم محیط مظہر، اپنی زبان، کلچر، تہذیب کو بچانے کی کاوش ہو یا لفظ و معنی کی بے تعلقی، تہذیب و کلچر کے سطحی اور وقتی شعور کا احساس، یہ متضاد اور مختلف تصورات و رجحانات اس وقت انسانی وجود میں ایک محشر برپا ہوئے ہیں جن کا اس وقت خود اس کو احساس اور خبر ہی نہیں ہے۔

اس وقت انسانی انفرادیت اور تخلیقیت، اجتماعیت اور یکسانیت کے ایک ایسے سیلاب کی یلغار میں ہیں جس کو سائنس، ٹیکنالوجی، کمپیوٹر، موبائل، تجزیاتی لسانیات اور تشریحی و وسعت پذیر اطلاقی ابلاغِ عامہ اور گلوبیاتی صارفیت کی قوتوں کا تعاون حاصل ہے۔ ہم اپنے سمارٹ فون، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ٹیلی وژن کے ذریعے دنیا کے بعید ترین گوشے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن ہمیں اپنے پڑوسی کے حالات و حالت اور خود اپنی کیفیت کا کوئی ادراک و شعور نہیں ہے۔''(۱) ایسے عالم میں جب انسانی وجود اور اس کی تخلیقیت اور انفرادیت کا شعور ہی خطرے میں ہو صرف ایک محدود زبان اور اس کا تہذیب و کلچر کی بحث ایک سائیڈ شو ہے لیکن چونکہ ہم اسی پر غور کر رہے ہیں لہٰذا اسے اس پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گلوبیت کی یلغار، زبان کو کلچر سے علیحدہ کر دینے اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی فتح سے، جس نے صارفیت کو خود ایک کلچر بنا دیا ہے، دنیا میں زبانوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ اب زبان صرف سرمائے اور علم کی زبان رہ گئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے مختلف علاقوں سے علاقائی زبانیں ناپید اور ختم ہو رہی ہیں۔ جس طرح انسانی مسکن اور آبادی کے پھیلاؤ اور خوراک پر ارتکاز اور زور کی وجہ سے بہت سے پودے، پرندے اور جانداروں کی اقسام ناپید ہو چکی ہیں اسی طرح عالمی علمی زبانوں کے پھیلاؤ سے علاقائی زبانوں کو یہی خطرہ درپیش ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس وقت تک دنیا سے اس کی آدھی زبانیں ناپید ہو چکی ہیں۔ آج ''یونیسکو کے اٹلس آف دی ورلڈ لینگویجز آف ڈینجر آف ڈس اپیرنگ'' کے مطابق دنیا کی چھ ہزار زبانوں میں سے گلوبیت کی وجہ سے پانچ ہزار زبانیں ناپید ہونے کو ہیں۔''(۲) کیا اردو ان میں سے ایک ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں چند حقائق کا جائزہ لینا پڑے گا لیکن حقائق ایسی شے ہیں جن سے اردو داں طبقہ اور اردو کے داعی بے نیاز ہیں۔ انھوں نے خود کو ایک مخصوص قسم کے تکبر اور غرور میں مبتلا کر رکھا ہے جو تقریباً اسی قسم کا ہے جس کا اظہار ''پدرم سلطان بود'' (۳) سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو زبان کے دنیا میں مقام کا سوال ہے۔ وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے ذیلی ادارہ ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی'' نے ۲۰۱۴ء میں دہلی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس کا موضوع تھا ''اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ'' اس میں ہندو پاکستان کے علاوہ دنیا بھر

سے اردو کے چوٹی کے علما نے حصہ لیا۔ اس بلند و بالا کانفرنس میں اردو کے بارے میں پیش کیے گئے حقائق کا جائزہ لیجیے تو اوپر بیان کردہ تلخ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ دنیا میں اردو کے مقام کے بارے میں ملاحظہ کیجیے۔ جناب سید تقی عابدی (کناڈا) لکھتے ہیں:

''یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔''(۴)

جناب امین حیدر (شکاگو) لکھتے ہیں:

''اردو زبان۔۔۔۔دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔''(۵)

سید اقبال حیدر صاحب (فرینکفرٹ جرمنی) لکھتے ہیں:

''اردو۔۔۔۔۔چوتھی سب سے بڑی زبان ہے۔''(۶)

ڈاکٹر آصف اعوان (پاکستان) کہتے ہیں:

''آج اردو کو دنیا کی تیسری بڑی زبان کا درجہ دیا جا رہا ہے۔''(۷)

ڈاکٹر احمد القاضی (قاہرہ، مصر) نے حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''اردو زبان کی بدقسمتی تو یہ ہے کہ بعض اردو دان اردو زبان بولنے والوں کی تعداد بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بولی جانے والی زبان کے اعتبار سے چینی زبان کے بعد اردو زبان دوسرے نمبر پر ہے۔''(۸)

ایک انتہائی اہم اور باوقار کانفرنس کے شرکا جو اپنی ذات اور اپنے ملک میں نہایت اعلیٰ عہدوں کے حامل ہیں، اردو زبان کے دنیا میں مقام، پھیلاؤ اور تعداد کے بارے میں اس طرح کے مبالغہ آمیز اور بے بنیاد خیالات کا اظہار کریں جن کا کوئی معروضی اور شماریاتی ثبوت موجود نہ ہو اردو خواں طبقے اور ان کے داعین کے اسی تکبر اور تصور کی وضاحت کرتا ہے، اسی طرح یہ دعویٰ کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی حامل تھی یا ہندوستان کے سیکولر مزاج کا اظہار تھی وغیرہ وغیرہ ایسے دعوے ہیں جن کا کوئی معروضی ثبوت نہیں دیا جاتا۔ یہ نعرے خوش کُن ہیں، کانفرنس کے شرکا انھیں سن کر تالیاں بجاتے ہیں، خوش خوش گھر جاتے ہیں اور منتظمین سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا حقِ نمک ادا کر دیا۔ آیئے ذرا اردو کے بارے میں زمینی حقائق کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو آج دنیا کے کسی بھی ملک، علاقے، ریاست یا خطے کی مادری زبان نہیں ہے اور اپنی پیدائش کے علاقوں یعنی دہلی اور لکھنو وغیرہ میں اپنا مقام و مرتبہ کھو چکی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اردو مختلف مادری زبان رکھنے والے لوگوں میں جو کہیں اکٹھے رہتے ہیں یا رہتے تھے ایک رابطے کی زبان تھی اور یہی حیثیت اس کی آج بھی ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر آج تک اس کی یہی حیثیت قائم ہے۔ شمال مغرب سے آنے والے منگول، ترک، افغان، ایرانی، عرب اور پشتون حملہ آوروں اور ان کے لشکروں نے یہاں پر پنجاب، دہلی، شمالی ہندوستان اور باقی علاقوں پر قبضہ کیا اور وہاں پر سکونت اختیار کی اور حکومت کی۔ انھوں نے پنجابی، کھڑی بولی، ہریانوی، پوربی، برج بھاشا وغیرہ کے علاقوں میں قیام کیا جہاں کے باشندوں کی زبان بھاشائیں تھیں، حکمرانوں اور رعایا کے درمیان اور اشرافیہ و عوام کے درمیان ملنا جلنا، رہنا سہنا اور مشترک کاروبارِ زندگی ایک حقیقت تھا لہٰذا ایک ملی جلی زبان نے جنم لیا جو یہ دونوں گروہ آپس میں معاملات کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے (۹) جبکہ یہ دونوں گروہ اپنے گھروں میں اپنے درمیان

اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتے تھے۔ سرکاری کاروبار کی زبان فارسی تھی جو انگریزوں کی آمد سے انگریزی میں بدل گئی۔ لیکن رابطے کی زبان اردو رہی یا اس کی دوسری صورت جس نے سیاسی اور مذہبی تعصّبات اور ضرورتوں سے جنم لیا اور ہندی کہلائی۔ شمال مغرب سے آنے والے ہمیشہ اپنی فارسی دانی میں فخر کرتے رہے (۱۰) اردو نے اس دور میں اپنی تمام اظہار و بیان کی صورتوں اور گرائمر تک کو فارسی سے اخذ کیا۔ فارسی کا ادب، فارسی کی ہیئتیں، فارسی کی تلمیحات، محاورات، اسماء الرجال سب فارسی سے حاصل کیے۔ غرض اس دور کی اردو میں سوائے افعال اور حروفِ ربط کے کچھ بھی مقامی نہ تھا (۱۱) اور اگر کبھی کچھ داخل بھی ہو گیا تو اصلاحِ زبان کے داعین نے اسے نکال باہر کیا۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی فارسی کا غلبہ ختم ہوا اور انگریزی اثرات، ذخیرۂ الفاظ، مغربی ہیئتیں، اظہار کی صورتیں اور مغربی تحریکوں کے اثرات اردو میں داخل ہونے لگے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی انگریزی کے اثرات قائم ہیں۔ اس لیے کہ زمانے نے ایک کروٹ لے لی ہے، اب زبان کسی قوم کی استعماری اور نوآبادیاتی پالیسی کا ذریعہ نہیں رہی خاص کر انگریزی، یہ اب علم و سائنس اور گلوبیت کی زبان ہے۔ تمام تر جدید علم اس زبان میں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۹۷ فی صد دنیاوی علم کا مرکز انگریزی ہے۔ (۱۲)

اردو پہلے فارسی کا ملا دوپیازہ تھی، اب یہ انگریزی کی مقلد ہے۔ یہ ایک موقعہ ہے جس سے اردو والوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور انگریزی کی مخاصمت چھوڑ کر اس کو اپنے ہاں جگہ دینی چاہیے۔ (۱۳) لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اردو اب بھی ایک طفیلی زبان ہے جس کا وجود دوسروں سے اخذ و استفادہ کی صلاحیت میں ہے۔ اردو کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ انگریزی سے قطع تعلق، اسے ترک کرنے اور اس کی مخالفت میں ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ اردو صرف بول چال کی زبان ہے یعنی یہ صرف سننے کی زبان ہے۔ لوگوں کا بڑا حصہ صرف اس کو سن کر سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی ہی سہی بول سکتا ہے۔ ایسے علاقے بہت کم ہیں جہاں اردو لکھنے اور کاروباری ریکارڈ کی زبان کا درجہ حاصل کر سکی ہے۔ پاکستان بھی۔ وہ ملک جس نے اردو کو اپنی قومی زبان قرار دیا ہے، اسے آج تک اپنی سرکاری اور ذریعۂ تعلیم کی زبان نہیں بنا سکا ہے۔ کوئی اردو داں جو صرف اردو پڑھ لکھ سکتا ہو اگر آج وہ دہلی یا لکھنو کے گلی کوچوں میں جائے تو وہ اپنے آپ کو ایک غیر ملک میں پائے گا جہاں تمام علامات، نشانات، سائن بورڈ، سڑکوں کے نام اور تمام کاروبار کا ذریعہ انگریزی یا ہندی ہے۔

اردو زبان کے پرجوش داعین کو سوچنا چاہیے کہ پاکستان کے آئین میں درج ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اس کو ۱۹۸۸ء تک نافذ کیا جانا تھا، تمام عوام اور ملک اس پر متفق ہے۔ پاکستان کی سپریم کورٹ یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ اس کو ملک میں سرکاری اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر نافذ اور اختیار کیا جائے، سب اس بات کو مانتے ہیں کہ اردو پاکستان کی تحریک کا ایک حصہ تھی۔ اس سب کے باوجود بھی ملک میں اردو زبان نافذ نہیں ہو سکی، اس کی کیا وجہ ہے؟ محض جذباتی ہونے کے بجائے اس کا گہرا تجزیہ ہونا ضروری ہے۔

اب ہم آتے ہیں اردو زبان کے مسلم انڈیا میں گنگا جمنی تہذیب کا اظہار ہونے کی طرف۔ اردو کس تہذیب کی علامت ہے! اس تہذیب کی جو مسلم حکمران اشرافیہ طبقہ نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے تقریباً ایک ہزار سالہ قیام کے دوران پروان

چڑھائی۔'' (۱۴) اسے گنگا جمنی تہذیب کہا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تہذیب ہندوستان میں مسلمان اشرافیہ، ان کے مصاحبین اور عمال کے رہن سہن ہی کا عکس تھی۔ اس میں ہندوستان کے وسیع عوام اور رعایا کا کوئی حصہ یا عمل نہ تھا، بڑے شہروں، حکمرانی اور فوج کے مرکزوں کے باہر عوام اپنی زندگی اس طرح بسر کرتے تھے جیسے وہ ہزاروں سال سے کر رہے تھے۔ ہندوستان میں ذات پات کے نظام اور گاؤں کی پنچایتی بندوبست نے یہ'' کارنامہ'' انجام دیا تھا کہ اس نے وسیع تر عوام کی زندگیوں کو حکمران طبقات کے رہنے سہنے سے متاثر نہ ہونے دیا تھا۔ صرف صوفیا جو عوام میں رہتے تھے انھوں نے کسی حد تک ان علاقوں کے لوگوں کو متاثر کیا جہاں وہ قیام پذیر رہے، باقی ہندوستان اپنی کھال میں مست رہا، شہروں میں اشرافیہ اور عمال، فارسی، ترکی اور افغان تہذیب سے کچھ متاثر ہوئے، فارسی زبان نے اردو کو جو رابطے کا ذریعہ تھی، شدید متاثر کیا اور فارسی تہذیب کی علامات، مختلف صورتیں، ہیئتیں اور روایات اردو شاعری میں شامل ہو گئیں۔ تحریری اردو زبان، ابتدا میں یا صوفیا کی زبان تھی، یا شاعری کی اور شاعری میں فارسی کا عکس تھی۔ اگر کہیں مقامی زبان اور تہذیب کی علامات اور اثرات اس میں داخل بھی ہوئے تو اصلاح پسند طبقے نے جو فارسی معیاروں پر ہی یقین رکھتا تھا انھیں نکال باہر کیا لہٰذا ۱۸۵۷ء تک اردو صرف ایک مراعات یافتہ حکمران، حاوی اور جابر طبقہ کی تہذیب و تمدن کی عکاس تھی جس کی بنیاد ایرانی تہذیب پر تھی (۱۴) اس میں مقامی اثرات بہت کم تھے (۱۵) ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں انگریزی اثرات داخل ہونا شروع ہوئے اور اب تک جاری و ساری ہیں۔ اردو زبان و ادب اس موقعہ پر انگریزی کے شدید زیرِ اثر ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں انگریزی زبان و ادب ہی اردو زبان و ادب کے لیے سرچشمہ اور نشانِ راہ کا کام کرتے رہے ہیں۔ آج بھی اردو ادب کی ہیئتیں اور ادب و تنقید کے تمام تر مباحث کا ذریعہ اور سرچشمہ انگریزی ہے، دوسری زبانوں جیسے روسی، فرانسیسی اور جنوبی امریکی ادب سے بھی جو خیالات اور تصورات اردو ادب میں آئے ہیں وہ بھی انگریزی کے ذریعے ہی آئے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں برصغیر سے ایک بڑا طبقہ ذرائع روزگار کی تلاش میں مغربی اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہجرت کر گیا۔ جو لوگ مغربی ممالک، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، ناروے، جرمنی وغیرہ میں گئے انھیں شہری آزادیاں ملیں اور روزگار کی آسانیاں بہم آئیں، وہ لوگ وہیں قیام پذیر ہو گئے لیکن روزگار ملنے کے ساتھ ہی انھیں اپنی شناخت اور حیثیت کے تعین کا احساس ہوا، لہٰذا انھوں نے اپنے ملکوں سے رابطہ رکھا اور اردو زبان و ادب سے بھی رشتہ جوڑا۔ ان ملکوں میں اردو کو کچھ فروغ حاصل ہوا لیکن یہ فروغ صحرا میں صدا کی طرح ہے۔ یقیناً وہاں پر اردو اخبار ہیں، اردو رسالے ہیں، ریڈیو، ٹی وی اردو پروگرام ہیں اور سکولوں میں کہیں کہیں تعلیم کی سہولت بھی ہے۔ یہ نسل اب اپنے اختتام پر ہے، ان کی دوسری نسل جو وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی، وہ اردو سے بے گانہ ہے اور ان پر مقامی رنگ غالب ہے۔ لہٰذا وہاں پر اردو کا موجودہ وجود زیادہ دیر پا نہیں، اردو کا جو بھی فروغ وہاں ہے وہ زیادہ تر مشاعروں اور ٹیلی ویژن پروگراموں سے ہے جو پرانی نسل، جو اب معدوم ہونے کے قریب ہیں، ان کا شوق ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ یہ فروغ صرف اردو سننے تک ہے یعنی مشاعرے اور ٹیلی ویژن پروگرام۔ اردو رسم الخط سے وہاں کی نئی نسل اور مزدور طبقہ اکثر بے بہرہ اور بیگانہ ہے۔

رہا مشرقِ وسطیٰ کا معاملہ جہاں صورت حال مختلف ہے کیوں کہ وہاں جو لوگ گئے ہیں انھیں وہ شہری حقوق اور آزادیاں حاصل نہیں ہیں جو مغرب میں ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ کبھی مستقبل قریب یا بعید میں ان سب کو واپس آنا پڑے۔ دوسری

صورت میں بھی جب یہ لوگ کام کرنے کی عمر سے گزر جاتے ہیں تو ان کو واپس ہی آنا پڑتا ہے۔ لہٰذا وہاں بھی اردو کا مستقبل خود ان لوگوں کے مستقبل کی طرح مخدوش ہے۔ یہ ہیں وہ معروضی حالات جن کو پیش نظر رکھ کر اکیسویں صدی میں اردو کے امکان اور فروغ کا جائزہ لینا ہوگا۔ لہٰذا جن نتائج پر ہم پہنچتے ہیں انھیں مختصراً مندرجہ ذیل طریقے سے لکھ سکتے ہیں۔

۱۔ اردو آج تک رابطے کی زبان رہی ہے اور مستقبل میں بھی اس کا مقدر یہی ہے۔ یہ ہند آریائی نسلوں اور بولیوں کے درمیان رابطے کا بہت اعلیٰ اور مفید ذریعہ ہے لیکن کسی ملک کی سرکاری اور ذریعۂ تعلیم کی زبان ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

۲۔ اردو زبان جس کلچر کی مظہر ہے وہ ایک جارح، حاوی اور خود پسند کلچر ہے جو ہندوستان میں حکمران طبقے اور اشرافیہ کے درمیان پروان چڑھا۔ اس کو ہندو پاکستان کے عوام کے کلچر سے کوئی قریبی رابطہ اور واسطہ نہیں ہے۔ ہر جگہ یہ مقامی مادری زبان اور مقامی کلچر پر حاوی ہونا چاہتا ہے لہٰذا اس کے خلاف ایک خاموش لیکن پر اثر مزاحمت موجود ہے۔ اردو زبان کو زندہ رہنے کے لیے اس ایلیٹ کلچر کو چھوڑ کر عوامی سطح پر آنا ہوگا۔

۳۔ اردو داں طبقہ کو بھی اپنے بے جا تفاخر اور غرور کو ترک کر کے معروضی حقائق کو سمجھنا ہوگا کہ اب اردو دنیا میں کہیں بھی کسی خطہ میں مادری زبان نہیں رہی۔ اس میں تاریخی، سیاسی جبر کا بھی حصہ ہے اور موجودہ حالات کا بھی۔ اب اس کا وجود صرف اس صورت میں باقی رہ سکتا ہے کہ یہ ایک طرف مقامی بولیوں اور کلچر کو جگہ دے اور دوسری طرف انگریزی میں علم و زبان کے ساتھ رابطہ استوار رکھے۔

۴۔ انگریزی اب کسی ملک کی استعماری زبان نہیں ہے بلکہ علم کی زبان ہے۔ اردو کا انگریزی سے گہرا تعلق رہا ہے اور اب بھی ہے لہٰذا اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی کے ساتھ اس گہرے تعلق کا فائدہ اٹھایا جائے۔ انگریزی سے مخاصمت کے بجائے مفاہمت اور اختلاف کے بجائے شراکت کی راہ اختیار کی جائے۔

۵۔ انگریزی سے تعلق کی وجہ سے اردو کو جدید ٹیکنالوجی، سائنس، ذرائع ابلاغیات اور جدید تصورات و خیالات تک رسائی حاصل ہے، ان کو اردو میں فروغ دیا جائے تاکہ اردو داں اور اردو خواں طبقہ بھی اس میں پوری مہارت اور دسترس حاصل کر سکے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ اردو داں طبقہ بھی جدید علم اور ٹیکنالوجی میں اتنا ہی ماہر ہوگا جتنا کہ انگریزی داں طبقہ ہے۔ جب اردو داں طبقہ خود علم کی تخلیق اور تحقیق میں خود کفیل ہو جائے گا اور دنیا کی راہنمائی کے قابل ہوگا تب وہ انگریزی سے بے نیازی کا سوچ سکتا ہے۔

زندگی ایک مسلسل عمل ہے۔ اکیسویں صدی کے چیلنجز اور امکانات سامنے آنے والے ہیں۔ قدامت پرستی، تنگ نظری اور جہالت سے جڑے رہنے سے قومیں فنا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مصالحت، بالغ نظری، مفاہمت اور اشتراک مستقبل کے امکانات کو درست طور پر بروئے کار لانے کے مواقع دیتے ہیں اور چیلنجز سے بھی اس ذریعے ہی سے نمٹا جا سکتا ہے۔ یہاں میں اقبال کی نظم ''زمانہ'' کے ان اشعار کے ساتھ اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں:

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل ، قصور تیرا ہے یا کہ میرا
میرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ(۱۷)

حوالہ جات

۱۔ حراری، بحوالہ اقصیٰ جاوید، ڈیلی ڈان (Books and Authors)، ۲۴ فروری ۲۰۱۹ء

۲۔ بحوالہ ڈاکٹر آصف اعوان، مضمون: اردو زبان کا فروغ۔ ماضی، حال اور مستقبل، مشمولہ: اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ، دہلی: ۲۰۱۴ء، ص: ۱۳۰

۳۔ ''پدرم سلطان بود'' (ترجمہ: ''میرا باپ بادشاہ تھا'') یعنی محض اپنے آباواجداد پر فخر کرنا اور خود اپنی حالت کو نہ دیکھنا۔

۴۔ اکیسویں صدی میں اردو کا فروغ۔ ماضی، حال اور مستقبل، محولہ بالا، ص ۴

۵۔ ایضاً، ص: ۳۴

۶۔ ایضاً، ص: ۹۹

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۶

۸۔ ایضاً، ص: ۱۲۱

۹۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، لاہور: ۲۰۰۷ء، ص: ۶۹

۱۰۔ غالب:

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

ترجمہ: میری فارسی شاعری پڑھو تا کہ آبِ رنگ رنگ کے شعر دیکھ سکو۔ میرے اردو کے مجموعے کو نظر انداز کرو کہ یہ بے رنگ ہے یعنی خوبصورت نہیں

۱۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۷

۱۲۔ اکیسویں صدی میں اردو کا فروغ، ماضی، حال اور مستقبل، محولہ بالا، ص: ۲۵۱

۱۳۔ آصف اعوان، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص: ۱۳۲

۱۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۵۔۲۳

۱۵۔ رام بابو سکسینہ، محولہ بالا، ص: ۳۰۔۲۹

۱۶۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، نظم زمانہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۵۸/ ۱۳۴

۱۷۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو (زمانہ، بالِ جبریل)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص: ۴۱۸

☆.....☆.....☆